شمس الرحمٰن فاروقی *

میر کی شعری روایت

بڑی خوشی کی بات ہے کہ میر کا ذکر اب کچھ زیادہ ہونے لگا ہے۔ ستمبر ۲۰۱۰ء میں میر کی وفات کو دو سو برس ہو گئے۔ اس مناسبت سے کہیں کہیں میر پر جلسے اور کہیں کہیں سیمینار ہوئے۔ لیکن اس ہماہمی اور گونج اور ذوق وشوق کے اظہار کا ایک شمہ بھی نظر نہ آیا جو غالب کی سو سالہ برسی پر کئی ملکوں میں دور دور تک پھیل گیا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ غالب سے منسوب دو بڑے اور قومی سطح کے اداروں یعنی غالب انسٹیٹیوٹ اور غالب اکیڈمی نے میر کی دو سالہ برسی کا لحاظ رکھا اور غالب انسٹیٹیوٹ نے اپنا سالانہ سیمینار میر کے نام معنون کیا اور غالب اکیڈمی کا سیمینار میر کی شعری روایت کی بازیافت اور غالب تک اس روایت کے سفر کی تاریخ کے مطالعے کی غرض سے منعقد کیا گیا۔

یہ سوال پوچھنا ضروری ہے کہ میر کی دو صد سالہ برسی کے موقعے کو ہم نے اردو شاعری اور میر کے تذکرے کے لئے اس جوش اور شدت سے کیوں نہ استعمال کیا جس جوش اور شدت کا اظہار ہم نے غالب کی یک صد سالہ برسی کے زمانے میں اردو شاعری اور غالب کے تذکرے کے لئے کیا تھا؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہوسکتا ہے کہ غالب کی شاعرانہ عظمت کا مرتبہ میر سے بالاتر ہے۔ یعنی میر کے مقابلے میں غالب عظیم تر شاعر ہیں، یا یہ کہ غالب ہمارے سب سے بڑے شاعر ہیں لہٰذا غالب کے تئیں ہمارے دل میں جو عزت اور محبت ہے وہ میر کے لئے نہیں ہوسکتی۔ مطلق

طور پر یہ جواب درست ہو یا نہ ہو لیکن منطقی اعتبار سے یہ جواب اس لئے غلط ہے کہ ہم صرف اپنے لئے یا صرف اپنی طرف سے، جواب دے سکتے ہیں۔ ہم تمام تاریخ کی طرف سے حکم نہیں لگا سکتے کہ غالب ہمارے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ کل کیا فیصلہ ہوگا اور کل کا تنقیدی مذاق اور کل کے قاری کا شعور کسی شاعر کے بارے میں کیا کہے گا، یہ ہم نہیں جانتے۔ ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج ہماری نظر میں غالب ہمارے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ لہٰذا صحیح جواب یہ ہوا کہ زمانۂ حال میں غالب کا مرتبہ میر سے بلند تر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ غالب کی صد سالہ برسی کو ہم نے اس جوش و خروش سے منایا۔

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ آج ہی نہیں، بلکہ گذشتہ زمانے میں بھی غالب کو میر سے برتر قرار دیا جاتا تھا۔ اس لئے گذشتہ تاریخ بھی ہمارے ساتھ ہے۔ اس جواب میں کئی کمزوریاں ہیں۔ ایک بالکل سامنے کا عیب تو یہی ہے کہ میر تو غالب کے پہلے تھے۔ اس لئے قبل از غالب کے زمانے میں تو میر سب سے بڑے شاعر رہے ہوں گے۔ (یہاں کوئی نہ کوئی فوراً غالب کے وہ دو تین شعر پڑھ دے گا جن میں غالب نے میر کی بزرگی کا اعتراف بھی کیا ہے۔) معترض کا استدلال یہ ہوگا کہ جب غالب آگئے تو میر کا درجہ غالب کے سامنے پست ہوگیا۔ آب آمد، تیمّم برخاست۔ لیکن یہاں مشکل یہ ہے کہ کل کلاں کوئی اور شاعر پیدا ہوسکتا ہے جو غالب کو تخت سے اتار کر ان کی جگہ لے لے۔

دوسری مشکل یہ ہے کہ ایک فیشن ایبل رائے تو یہ ہے (اگرچہ اس کا زور اب کم ہوگیا ہے) کہ ان کے اپنے زمانے میں غالب کی کچھ بھی قدر نہیں ہوئی، یا ہوئی تو اتنی نہیں جتنی اب ہے۔ مصطفیٰ خان شیفتہ پر غالب کو اتنا اعتماد تھا کہ جب تک شیفتہ کی پسندیدگی نہ حاصل کر لیتے، اپنی (فارسی) غزل دیوان میں درج نہ کرتے۔ ان کا بہت مشہور شعر ہے ـــ

غالب بہ فن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیواں غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نہ کرد

لیکن خود شیفتہ نے مومن کی شاگردی اختیار کی۔ مومن کا انتقال ۱۸۵۲ء میں ہوا اور غالب کا ۱۸۶۹ء میں، لیکن مومن کے بعد بھی شیفتہ نے غالب کی شاگردی نہ اختیار کی۔

مومن کو غالب پر کسی نہ کسی طور سے فوقیت دینے والے تو عہد حاضر میں بھی موجود تھے۔ حسرت موہانی نے اپنے مجوزہ تذکرۂ شعرا کے لئے کئی چھوٹے چھوٹے مضمون لکھے تھے۔ مومن پر مضمون (اول طباعت ۱۹۰۵ء) میں حسرت نے اردو شاعری کے اعتبار سے ذوق کو مومن اور غالب دونوں سے برتر ٹھہرایا ہے۔ یہ مضمون احمر لاری نے اس مجوزہ تذکرے کے مضامین سے اپنے انتخاب میں اور بعد میں شفقت رضوی نے ان مضامین کے مکمل مجموعے میں شامل کر دیا اور آسانی سے دستیاب ہے۔ نیاز فتحپوری کا مضمون نگار کے مومن نمبر میں چھپا تھا۔ اس میں انھوں نے کلیات میر کے بعد جس دیوان کو سب پر فوقیت دی تھی وہ مومن کا دیوان ہے، غالب کا نہیں۔ حکیم سید اعجاز احمد معجز سہوانی کی چھوٹی سی کتاب مومن و غالب بقول شمس بدایونی ۱۹۳۱ء میں چھپی تھی۔ میں نے مدت ہوئی یہ کتاب پڑھی تھی اور اس وقت میں معجز سہوانی کے انداز کلام پر بہت جھنجھلایا تھا کہ انھوں نے ہر جگہ مومن کو غالب پر فوقیت دی تھی۔ اس رسالے کی تفصیل شمس بدایونی نے اپنی کتاب غالب اور بدایوں میں مشروحاً لکھ دی ہے۔

ڈاکٹر عبداللطیف جو غالب کے جدید نقادوں میں خاصے نمایاں رہ چکے ہیں، وہ غالب سے کس قدر خفا اور مایوس تھے، یہ ہم سب جانتے ہیں۔ ان کی کتاب انگریزی اور اردو میں اب بھی دستیاب ہے۔ غالب کے خلاف یگانہ کی زہرافشانیاں بھی ہمارے سامنے ہیں۔ محمد حسن عسکری کی کئی تحریریں موجود ہیں جن میں انھوں نے غالب کو میر سے کمتر ٹھہرایا تھا۔ عسکری کے شاگرد معنوی سلیم احمد کا بھی یہی خیال تھا اور انھوں نے عسکری صاحب کے خیالات کو بہت پھیلا کر اپنے انداز میں اپنی کتاب غالب کون؟ میں بیان بھی کر دیا ہے۔ اس لئے یہ دعویٰ پوری طرح صحیح نہیں کہ تاریخ کی گواہی یہی ہے کہ غالب ہمارے سب سے بڑے شاعر ہیں۔

غالب کے بارے میں ایک تنقیدی رائے یہ ہے کہ اور کچھ نہ ہو، لیکن غالب کی شاعری ہمارے ذہن کو، یعنی جدید ذہن کو متاثر کرتی ہے اور غالب ہمیں بالکل جدید شاعر لگتے ہیں۔ نیا

ذہن اور غالب کا ذہن کم وبیش پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ میر کے بارے میں کئی لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا کلام اب ہمارے لئے فوری اور بامعنی نہیں رہا۔ سو پچاس شعر ضرور میر کے یہاں ایسے ہوں گے جو ہمارے ذہن کو غالب کے شعروں کی طرح متاثر کریں، لیکن عمومی طور پر میر کا نہ تو کلام ہی اس قدر اعلیٰ درجے کا ہے اور نہ اسے ہمارے ذہن سے کوئی قربت ہے۔

مندرجہ بالا بیان کا یہ حصہ بالکل درست ہے کہ غالب اور جدید ذہن میں بڑی ہم آہنگی ہے، لہٰذا جدید ذہن میر کے مقابلے میں غالب کو فوقیت دیتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے غالب صدی اتنے بڑے پیمانے پر منائی۔ لیکن یہ بیان ہمیں میر یا غالب کے بارے میں کسی آفاقی سچائی سے روشناس نہیں کرتا۔ یہ بیان صرف ہمارا فیصلہ ہے، تاریخ کا نہیں۔ ہم تاریخ کی طرف سے فیصلہ نہیں کرتے، بلکہ صرف اپنی طرف سے فیصلہ کرتے ہیں۔ ممکن ہے کل کا جدید ذہن خود کو غالب سے بالکل خارج از آہنگ پائے۔ یا کل کا قاری غالب کو قبول کرنے سے انکار کردے، خواہ یہ کسی غلط فہمی ہی کی بنا پر کیوں نہ ہو۔ ہم ان باتوں کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتے۔ ہم صرف اپنے بارے میں جانتے ہیں۔

اب اس بات پر بھی غور کرلیں کہ کیا کوئی شاعر صرف اپنے آپ میں قائم ہوسکتا ہے؟ یعنی کیا یہ ممکن ہے کہ شاعر کو اس کی شعری روایت سے الگ کر کے بھی دیکھا یا سمجھا جا سکے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ لیکن گذشتہ پوری صدی سے زیادہ کی بیشتر تنقید غالب ہمیں یہی باور کراتی رہی ہے کہ غالب اپنی جگہ بالکل تنہا ہیں۔ ان کو سمجھنے کے لئے فارسی جاننے کی ضرورت نہیں۔ اور فارسی ہی کیا، ہمیں غالب کے پہلے کی اردو بھی جاننے کی ضرورت نہیں۔ صاف لفظوں میں کہا تو نہیں گیا، لیکن غالب کے بارے میں ہماری عام تنقیدی فضا یہی تھی کہ اردو میں کوئی ایسی روایت شعر نہیں ہے، جس سے غالب کا رشتہ جوڑا جاسکے۔

یہ بات اب جا کر کسی حد تک ہماری سمجھ میں آرہی ہے کہ شعر کو قائم ہونے اور صحیح یعنی valid ہونے کے لئے سیاست، یا تاریخ، یا شاعر کی سوانح عمری، یا غیر ادبی اصولوں (مثلاً شاعر کے زمانے کے سماجی حالات) کو معرض بحث میں لانا ضروری نہیں، بلکہ اکثر یہ نقصان دہ بھی ہوسکتا

ہے۔ لیکن شعر کو قائم اور صحیح ہونے کے لئے اس کی ادبی روایت، اس کی ادبی تہذیب، اور اس کو پیدا کرنے والی تہذیب کے تصور کائنات کو جانے بغیر ہم شعر کو سمجھ ہی نہیں سکتے، اس کا قائم ہونا یا صحیح ہونا تو دور کی بات رہی۔ اس بات کو ہم اب بھی پوری سمجھ نہیں پائے ہیں۔

غالب کا المیہ، بلکہ ہمارا المیہ یہ تھا کہ ہم نے غالب کے بارے میں فرض کرلیا کہ وہ ایک بالکل خالی بیابان میں تنہا شجر ہیں۔ ان کے پہلے کوئی اور شجر کیا، گھاس بھی نہیں تھی۔ ہم نے سائنس میں یہ بات تو قبول کرلی اور ہمیشہ کے لئے مان لی کہ گھاس نہ ہوتی تو پیڑ بھی نہ ہوتا۔ لیکن ہم نے حالی کی یہ بات بھی فوراً مان لی کہ غالب کا ذاتی اور شعری مزاج یہ تھا کہ وہ شارع عام پر چلنے سے بچتے اور کتراتے تھے۔ جس طرز کا شعر پہلے کہا جاچکا تھا، حالی کے بقول غالب اس طرز کا شعر ہرگز نہ کہتے تھے۔ چنانچہ غالب ہماری تہذیب کا ایسا درخت ہیں جن کے پیچھے کوئی میدان نہ تھا۔ وہ درخت اپنا جواز اور اپنا وجود آپ تھا۔

اگر کبھی کبھی یہ کوشش کی بھی گئی کہ غالب کے تہذیبی سرچشموں اور ان تخلیقی نمونوں کو دریافت یا متعین کیا جائے جن سے غالب متاثر ہوئے ہوں گے، تو غالب کے اصل الاصول، یعنی ان کے حقیقی تخلیقی سرچشمے، یعنی سبک ہندی کو معرض بحث میں لائے بغیر سبک ہندی کے کچھ شعرا مثلاً بیدل، شوکت بخاری، جلال اسیر، وغیرہ کی شاعری کو غالب کے ''ابتدائی دور'' کی شاعری پر اثر انداز بتایا گیا، اور وہ بھی ناپسندیدگی کے لہجے میں۔ ''ابتدائی دور'' کی تخصیص بھی اسی لئے کی گئی کہ غالب کی صرف اس شاعری پر گفتگو ہو جسے خود غالب مہمل کہہ کر مسترد کرچکے تھے۔

جب یگانہ نے غالب کے سو پچاس شعروں کو فارسی کے شعرا سے مستعار اور مستفاد بتایا تو انھوں نے گویا غالب کا بھانڈا ہمیشہ کے لئے پھوڑ دیا۔ یگانہ نے غالب کو کسی خالی بیابان کے تنہا درخت کے بجائے کچھ قدیم چھتنار درختوں کے تنوں سے چمٹی ہوئی امربیل کی طرح فرض کیا جو صرف ان درختوں کی وجہ سے زمین پر قائم تھی۔ اس الزام کو بعض لوگوں نے اتہام سمجھا۔ بعض لوگوں نے غالب کے مبینہ مستعار یا مسروقہ شعروں کی تاویل کرنے کی کوشش کی۔ اس بات پر غور نہ کیا گیا کہ جس ادبی تہذیب نے غالب کی پرورش کی تھی اس میں سرقہ اور استفادہ کا وہ تصور نہ تھا

جسے ہمارے یہاں انگریزی تعلیم نے عام کیا تھا اور جس کی بنیاد اس تصور پر تھی کہ ہر شاعر اپنی جگہ تنہا ہوتا ہے کیونکہ وہ صرف اپنی بات کہتا ہے۔ ٹیری ایگلٹن (Terry Eagleton) کے بقول، شعر کو شاعر کی ذاتی ملکیت تصور کرنا سرمایہ دارارانہ رویہ ہے اور قبل جدید عہد میں موجود نہ تھا۔ بہر حال یگانہ، اور غالب کے مدافعت کار، دونوں ہی مضمون آفرینی کے بنیادی اصول سے ناواقف تھے۔ غالب کی تہذیب میں تو یہ بات مستحسن تھی کہ اوروں کے مضمون کو اپنا کر لیا جائے، یعنی اس میں کوئی اضافہ یا کوئی نئی جہت اضافہ کی جائے۔ اور کچھ نہیں تو کسی اور کی کہی ہوئی بات کو بہتر اسلوب میں کہہ دیا جائے۔

یہاں اس بات کا موقع نہیں، اور نہ ضرورت ہے کہ مضمون آفرینی کے اصولوں پر روشنی ڈالی جائے۔ بس یہ بنیادی بات عرض کر دینا ضروری ہے کہ مضمون آفرینی کا تصور ہی اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ کوئی شاعر اکیلا نہیں ہوتا۔ اس کے پہلے بھی بہت سے شاعر ہوتے ہیں۔ اور ان پہلے والوں کو جانے بغیر آپ ان کے بعد میں آنے والے شاعر کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔

ایک سامنے کی بات ہے کہ شاہ نصیر، ناسخ، آتش، یہ سب غالب کے پہلے تھے۔ شاہ نصیر نہ سہی، ہم نے ناسخ ہی کو پڑھ لیا ہوتا تو ہم یہ جان لیتے کہ ناسخ کے بغیر غالب کا وجود میں آنا غیر ممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور تھا۔ اور اگر ہم نے شاہ نصیر کو پڑھا ہوتا تو ہم یہ بھی جان لیتے کہ شاہ نصیر نہ ہوتے تو ذوق کا بھی وجود میں آنا بہت مشکل تھا۔ ہم لوگوں کو پڑھایا گیا تھا کہ استادی شاگردی کا ادارہ بہت نقصان دہ تھا، کیونکہ استاد اپنے شاگرد پر حاوی ہو کر اسے اپنے رنگ میں رنگ لیتا تھا اور شاگرد بچارے کی انفرادیت قتل ہو جاتی تھی۔ اور یہ بات غالب کی شان میں بڑے فخر سے کہی گئی کہ ان کا کوئی استاد نہ تھا۔ ہم لوگوں نے اپنی تاریخ کو پڑھ لیا ہوتا تو ہم نے مصحفی کے دیوان ششم کے دیباچے میں یہ بھی دیکھ لیا ہوتا کہ بوڑھا استاد مصحفی کھلے بندوں کہہ رہا ہے کہ میرے شاگرد آتش نے جوانی ہی میں وہ رنگ پیدا کیا ہے کہ خود میں اس بڑھاپے میں اس کا رنگ اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مصحفی کا آٹھواں دیوان سراسر اس رنگ میں ہے جسے خیال بندی کہتے ہیں اور جو ناسخ و آتش کا بھی رنگ ہے اور جسے شاہ نصیر نے بیش از بیش برت کر رائج کیا تھا۔

اب اگر غالب کے پہلے ناسخ تھے اور ذوق سے پہلے شاہ نصیر تھے، اور مصحفی کے بعد، لیکن ایک معنی میں ان کے ''پہلے'' آتش تھے، تو ان لوگوں کے پہلے بھی کوئی رہا ہوگا؟ یہ سوال اس طرح پوچھا جائے تو ناسخ اور ذوق کے ان مشہور شعروں کے معنی ٹھیک سے سمجھ میں آئیں گے ——

شبہ ناسخ نہیں کچھ میر کی استادی میں
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں (دیوان اول)

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

ناسخ کے شعر میں میر کی تقلید کا ذکر نہیں۔ ناسخ صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ جو شخص میر کی استادی پر یقین نہیں رکھتا وہ طبع رسا بھی نہیں رکھتا۔ ذوق نے ممکن ہے غالب پر طنز کیا ہو، لیکن ان کی اصل بات صرف اتنی ہے کہ غزل میں میر کی تقلید کوئی نہ کر سکا، چاہے اس نے کتنا ہی پیچ و تاب کیوں نہ کھایا ہو۔ یہ اشعار میر کے تاریخی اور ادبی وجود کی تصدیق کرنے کے لئے اور یہ بات سمجھانے کے لئے کہے گئے کہ اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا۔ اب یہ ہمارا فرض تھا کہ میر سے ناسخ اور پھر غالب تک کسی قسم کا تسلسل دریافت کرتے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد ہمارے یہاں سیاسی انقطاع اس قدر زبردست اور اس قدر موثر طور پر واقع ہوا کہ میر کے بعد جو کچھ ہوا ہم نے اسے بھلا کر غالب پر تنہا تکیہ کیا۔ اور میر کو بھی ہم نے اسی لئے موجود مانا کہ ناسخ اور غالب نے انھیں موجود مانا تھا۔

اگر ہم انقطاع کا مزید ثبوت دیکھنا چاہتے ہوں تو آب حیات میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس بے مثال خوبصورتی کی حامل لیکن بے حد گمراہ کن اور تخریبی کتاب نے ہمیں پہلے تو یہ بتایا کہ اردو زبان بھاکا سے نکلی ہے۔ اس ایک جملے نے گجرات اور پھر دکن اور پنجاب میں اس کے وجود کو عدم

وجود بنا دیا۔ اردو کی جو اصل شکل تھی، یعنی وہ زبان جسے آج ہم کھڑی بولی کہتے ہیں اور جسے آزاد کے کچھ ہی بعد گریرسن وغیرہ مجبور ہو کر ''مغربی ہندی'' کہہ رہے تھے، اس کے بارے میں آزاد کے یہاں ایک جملہ نہیں۔ اور جب گجرات اور دکن اور پنجاب میں اردو زبان ہی نہ تھی تو اس میں شعر، یا کسی قسم کے ادب کا وجود غیر ممکن تھا۔ ولی سے گریز اس لئے نہ ہو سکتا تھا کہ شاہ حاتم اور آبرو اور کئی اور دلی والوں نے ان کے ہونے کا اقرار کیا تھا۔ بس ولی کو اردو کا پہلا شاعر بنا دیجئے اور میر کی نکات الشعرا کے کسی نسخے سے (جو آج موجود نہیں) یہ جملہ درج کر دیجئے کہ ''وے شاعریست از شیطان مشہور تر۔'' چلئے اردو کی روایت سے ولی بھی خارج ہوئے کیونکہ میر انھیں کچھ نہ سمجھتے تھے۔

میر کا اثر کیوں اور کس طرح پھیلا، اور میر کے لائے ہوئے انقلاب کی نوعیت کیا تھی، اسے سمجھنے کے لئے ہمیں ولی کے بارے میں جاننا چاہیئے۔ ولی نہ ہوتے تو میر کا ہونا اگر ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور تھا۔ میں اسے سرے سے ناممکن نہیں کہتا کیونکہ میر نے خود ہی ریختہ، یعنی اردو کی شاعری کے بارے میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ یہ فارسی والوں کے طرز میں شاہجہاں آباد کی زبان میں ہے۔ مگر یہ بات تو یقینی ہے کہ میر کے انقلاب کے لئے ولی نے راہ ہموار کی تھی۔ ولی اور میر میں وہی رشتہ ہے جو ناسخ اور غالب میں ہے۔ اردو شاعری میں غالب نے جو انقلاب برپا کیا اس کی بہت کچھ تیاری ناسخ اور آتش کے ذریعہ ہو چکی تھی۔

آتش نے کہا تھا—

بلند و پست عالم کا بیاں تحریر کرتا ہے
قلم ہے شاعروں کا یا کوئی رہرو ہے بیہڑ کا

اس کے باوجود ہمارے نئے زمانے میں یہ اصول بنا اور مشہور ہوا کہ شاعری تو ''داخلی'' شے ہے۔ لہٰذا شاعر، یا کم سے کم ''سچا'' شاعر، اپنے دل کا حال بیان کرتا ہے۔ جس ادبی معاشرے میں ایسا اصول رائج ہو جائے وہ روایت کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔ یہاں تو سب

شاعر اپنے اپنے کلبۂ احزاں میں بیٹھے اپنے دل کا حال کہتے رہتے ہیں۔ ایسے حالات میں روایت کا تصور آئے تو کہاں سے آئے۔ بعد میں جب روایت کے بارے میں کچھ بات ہونے لگی تو کہا گیا کہ روایت کے ''صالح'' عناصر کو اختیار یا قبول کر سکتے ہیں۔ گویا روایت کوئی مردہ جسم ہے جس میں سے وہ اعضا جو صحت مند ہیں انھیں نکال کر دوسرے اپنے کام میں لا سکتے ہیں، لیکن جو اعضا کہ فاسد ہیں، انھیں سختی سے مسترد کر دینا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے غزل کے بڑے حصے کو مسترد کر دیا۔ دوسرے اصناف کے بارے میں یہ تصور قائم ہوا کہ یہ زیادہ تر فاسد ہیں۔ یہ تصور بھی قائم ہوا کہ (مثلاً) قصیدے کی شعریات اور ہے، غزل کی شعریات اور ہے۔ پھر یہ تصور بھی عام ہوا کہ ہر بڑا یا اہم شاعر اپنی شعریات، لہٰذا اپنی روایت الگ قائم کرتا ہے۔ چنانچہ میر کی روایت اگر کچھ تھی تو وہ الگ ٹھہری اور غالب کی روایت الگ ٹھہری۔ ایک بار میں نے کہیں لکھا کہ میر اور غالب کی شعریات ایک ہی ہے تو مرحوم پروفیسر محمد حسن صاحب نے جواب میں کہا جو شخص میر اور غالب کی شعریات کو ایک ہی مانے، اسے میر کے بارے میں کچھ معلوم ہے نہ غالب کے بارے میں۔

ایمان کی بات یہ ہے کہ شعریات تو سب کی ایک ہے، نہ صرف میر و غالب کی، بلکہ ولی اور ناسخ کی بھی شعریات ایک ہے۔ یعنی شعر کس طرح بناتے ہیں اور شعر کس طرح با معنی بنتا ہے، ان دونوں سوالوں کا جواب ان چاروں حضرات کے یہاں ایک ہی تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ناسخ اور غالب دونوں نے میر کو بڑا شاعر مانا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ حاتم اور آبرو نے ولی کی استادی کا اعتراف کیا اور آزاد (اور ان کے پہلے قدرت اللہ قاسم) کی روایت کے مطابق میر کے ''شاعریست از شیطان مشہور تر'' کے جواب میں پیر خاں کمترین (آزاد نے ''میر خاں'' لکھا ہے) نے کہا—

ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں

قدرت اللہ قاسم نے یہ بھی لکھا ہے کہ کمترین نے میر کے اس جملے پر خفا ہو کر میر کی کئی ہجویں ''بوا جی'' لکھیں۔ اگر اس ہجوگوئی میں کچھ ذاتی عناد بھی شامل رہا ہو تو بھی یہ تو ظاہر ہے کہ

پیرخاں کمترین کو میر کی بات ناگوار گذری تھی۔ اغلب ہے کہ میر نے ''از شیطان مشہورتر'' کہیں لکھا یا کہا ضرور ہوگا، کیونکہ قدرت اللہ قاسم نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اور مصحفی کا بھی ایک شعر دیوان اول میں ہے ___

ہونا بہت آسان ہے شیطان سے مشہور
پر ہو تو لے اول کوئی دنیا میں ولی سا

اگر میر کے مبینہ جملے کو مبنی بر حسد قرار دیا جائے تو مصحفی کے شعر سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ اپنے زمانے میں اور اپنے زمانے سے قریب تر زمانے میں ولی کے بلند مرتبے کے بارے میں عموماً کسی کو شک نہ تھا۔

ولی کے بہت سے شعر ایسے ہیں جن پر میر کا گمان گذر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ولی کا انداز میر کے یہاں بہت ترقی کر کے آیا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ولی بہت بڑے شاعر تھے، لیکن میر سے بڑے شاعر نہ تھے۔ میر بہت عالی دماغ شاعر ہیں حالانکہ ایک دو بار کے پڑھنے میں یہ بات کھلتی نہیں۔ غالب کو ہمارے یہاں سب سے بڑھ کر عالی دماغ مانا جاتا ہے۔ لیکن اگر ایک طرف ولی سے، اور ایک طرف سودا اور درد سے مقابلہ کریں تو میر کے بھی مقابلے میں ان دونوں کی دماغی قلمرو محدود لگتی ہے۔ بہر حال، ولی کے یہ چند شعر دیکھئے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کا فیضان میر تک پہنچا ہے، اور پھر وہاں سے ناسخ و غالب تک ___

یا لفظ ہے رنگین ہم آغوش معانی
یا بر میں گل اندام کے گلرنگ قبا ہے

اے اہل ہوس نگاہ مت کر
بالائے سہی قداں بلا ہے

یک دل نہیں آرزو سوں خالی
بر جا ہے محال اگر خلا ہے

عدم ہے تجھ دہن کا جگ میں ثانی اے پری پیکر
اگر بالفرض والتقدیر ثانی ہے تو عنقا ہے

رات کو آؤں اگر تیری گلی میں اے حبیب
زیور لب ذکر سبحان الذی اسریٰ کروں

خم ہوئی قوس قزح اس کا خم ابرو دیکھ
جس نے دیوار میں غم کی کیا محراب مجھے

یوں دوستاں کے ہجر میں داغاں ہیں سینے پر ولی
صحرا کے دامن کے اُپر جیوں نقش پائے رہرواں

لکھا ہے صفحۂ ایجاد پر مصور صنع
قلم سوں موئے کمر کے نگار ناز و ادا

ذرا اس آخری شعر پر غور کیجئے۔ میر کے یہاں کبھی کبھی تجرید ملتی ہے۔ لیکن ناسخ اور غالب ہمارے یہاں تجرید کے بادشاہ ہیں۔ لیکن ولی کے اس شعر جیسی تجرید تک پہنچنے میں ناسخ اور غالب کو بھی ایک عمر لگتی۔ معشوق کی کمر کو بال کی طرح باریک فرض کرتے ہیں۔ لہٰذا ''موئے کمر''؛ ''موئے میاں'' کی تراکیب بنیں۔ ان سے یہ معنی بھی برآمد کئے گئے کہ معشوق کی کمر دراصل ایک

بال ہی ہوتی ہے، یا معشوق کی کمر میں ایک بال بھی ہوتا ہے جسے موے کمر یا موے میاں کہنا چاہیئے۔ چنانچہ غالب کا لاجواب شعر ہے —

جزوے از عالمم و از ہمہ عالم بیشم
ہم چو موے کہ بتاں راز میاں برخیزد

اب ولی کا شعر دیکھئے۔ اللہ کے اسماے حسنیٰ میں ایک نام مصور بھی ہے، یعنی تصویریں بنانے والا۔ صنع کے معنی ہیں مشاق، ہنرور۔ اللہ تعالیٰ وہ ہنرور مصور ہے جو صفحۂ ایجاد پر موے کمر کے برش یعنی موقلم کے ذریعہ ناز و ادا کے نگار بناتا ہے۔ ہاتھ یا پاؤں پر مہندی سے جو پھول پتیاں اور نقش بنائے جاتے ہیں انھیں ''نگار'' کہتے ہیں۔ معشوق کو بھی ''نگار'' کہتے ہیں، اور موے کمر کے بارے میں ہم جانتے ہی ہیں کہ معشوق کی کمر میں ہوتا ہے۔ اب اس سے بڑھ کر تجرید کیا ہوگی کہ صفحۂ ایجاد خود ہی تجریدی تصور ہے، اس پر ناز و ادا جیسی چیز کی تصویر بنے جس کو نہ لفظ بیان کرسکتا اور نہ کوئی نقش اس کی نمائندگی کرسکتا ہے، اور جو صرف محسوس کرنے کی چیز ہے۔ ایجاد کے صفحے پر تصویر بنے، اور وہ بھی معشوق کے موے میاں سے اور مصور بھی کون؟ خالق اور باری اور مصور، جو بقول میر پردے ہی میں تصویریں بناتا ہے —

عالم آئینہ ہے جس کا وہ مصور بے مثل
ہائے کیا صورتیں پردے میں بناتا ہے میاں

میرے خیال میں مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ ولی اور میر کا ایک شعر سنا کر آپ سے رخصت لیتا ہوں۔ ولی —

تجھ عشق سوں کیا ہے ولی دل کوں بیت غم
سرعت ستی اے معنی بیگانہ من میں آ

''معنی بیگانہ''، یعنی ایسا مضمون جو بہت دور کا ہو، جو کسی نے نہ باندھا ہو۔ تو جس شے کے فراق میں متکلم نے اپنے دل کو بیت الحزن بنایا ہے وہ معشوق نہیں، بلکہ ایسا مضمون ہے جو کسی کو نہ سوجھا ہو۔ دوسری طرف، یہ معشوق کے لئے استعارہ بھی ہے کہ وہ ایسا معنی ہے یعنی ایسی حقیقت ہے کہ جو غائب از نظر ہے۔ بقول میر —

وہ کم نما و دل ہے شائق کمال اس کا

جہاں ولی نے معشوق اور مضمون کو ایک کر دیا ہے وہاں میر نے دونوں کو الگ رکھا ہے لیکن یہ کہا ہے کہ غم مضموں یا غم معشوق، انسان بننے کے لئے دو میں سے ایک ضروری ہے —

غم مضموں نہ خاطر میں نہ دل میں درد کیا حاصل
ہوا کاغذ نمط گو رنگ تیرا زرد کیا حاصل

نوٹ

قدرت اللہ قاسم کے بیانات کی طرف مجھے متوجہ کرنے اور مصحفی کے دیوان ششم کے دیباچے اوران کے شعر (مشمولۂ دیوان اول) کے شعر کی خبر دینے کے لئے میں پروفیسر حنیف نقوی کا ممنون ہوں۔ میرا خیال تھا کہ آتش کے بارے میں مصحفی کا قول میں نے ان کے کسی تذکرے میں دیکھا تھا،لیکن حنیف نقوی نے مجھے بتایا کہ یہ بیان دراصل مصحفی کے دیباچۂ دیوان ششم میں ہے جو فی الوقت میری دسترس میں نہیں ہے۔ میں بہر حال حنیف نقوی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

الٰہ آباد،فروری ۲۰۱۱ شمس الرحمٰن فاروقی

شمس الرحمٰن فاروقی کا شماراس دور میں دنیائے اردو کے معتبر ترین اور ممتاز ترین محققوں، نقادوں اور قلم کاروں میں ہوتا ہے۔

زیرِ نظر مضمون ان کے ایک لیکچر کا متن ہے جوانہوں نے بھارت کی غالب اکیڈمی میں میر پر ایک سیمینار میں دیا تھا۔